© rasailojaraid.com

درست ہے کہ ان میں شاعروں نے گزرے ہوئے واقعات کی تصویریں اسی طرح کھینچی ہیں جیسی نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ بیانیہ انداز میں ہمیں افسانوں اور ناولوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس شاعری کی ان چند خصوصیات کے علاوہ غزل کا پیرایہ اختیار کیا اور اشعار میں واقعات کے خارجی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ کبھی بڑے صاف صاف اور واضح لفظوں میں اور کبھی ایسے استعاروں، کنایوں اور علامتوں کے ذریعے جو ہماری شاعرانہ روایت کا جزو لاینفک بن گئی ہیں، ان احساسات کی عکاسی اور ترجمانی کی ہے جن میں خارجی عنصر سے زیادہ داخلی کیفیتوں کا رنگ غالب ہے۔ غریب الوطنی کے غم [illegible] ان لمحوں کی یاد، نئی زندگی کی طرف سے مایوسی [illegible] مختصر دور کے عام موضوعات ہیں اور ان سب کے ذکر سے ہمارے کسی غزل گو کی شاعری خالی نہیں۔ [illegible] کی بے سروسامانی، ماضی کی یاد، یارانِ ہمدم کے چھٹنے کا غم، امیدوں کو [illegible] ناکامی کا احساس، یہ سب باتیں دل میں خلش پیدا کرتی ہیں تو شاعر اپنی غزل کو اس خلش کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے اور غزل کے شعر اس غم اور ناکامی کے احساس کی تصویریں بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ چند شعروں میں اس خلش کی جھلک دیکھیے:

اس غم انگیز ذکر کا آغاز حفیظ ہوشیارپوری کے دو شعروں سے کرتا ہوں:

سنا رہا ہوں برنگِ غزل زمانے کو — حکایتِ غمِ دوراں، فسانۂ غمِ دل
چلے گئے جو حریفانِ دل نواز حفیظ — اب ان کا ذکر ہے اور یادِ گرمیٔ محفل

غریب الوطنی کا یہ احساس جب داخلی انداز اختیار کرتا ہے تو سوز کی کیفیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے:

کئی چراغ جلائے امیدِ فردا نے — اجڑ کے بس نہ سکے پھر دلوں کے ویرانے
صدا یہ آتی ہے مانوس رہگزاروں سے — کبھی تو گزریں گے پھر اس طرف سے دیوانے

ناصر کاظمی نے فسادات کے واقعات کو کبھی تو ایسے خارجی انداز میں کہ وہ انداز غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا اور کبھی بڑے غم انگیز اور درد بھرے لہجے میں داخلی رنگ دے کر اس طرح بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی صنف کی تخلیق ہی ان واقعات و واردات کے ذکر کے لیے ہوئی ہے:

شہر در شہر خون بہائے گئے — یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار — عصمتوں کے دیے بجھائے گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہنماؤں کی غفلتوں کے طفیل　　قافلے راہ میں لٹائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی　　اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل نہ تھا باقی　　اک طرف جشنِ جم منائے گئے
اور بھی ایسے حادثے ہیں جو　　پردۂ راز میں چھپائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر　　خار و خس کی طرح بہائے گئے

ناصر کی ساری غزل یادوں کا نوحہ ہے۔ انقلاب نے آبادیوں کو خرابہ بنا دیا اور دوست دوست سے بچھڑ گئے۔ یہ وہ غم ہیں جنہیں ناصر کبھی نہیں بھولتا اور جب ان غموں کا ذکر میر کے سے سادہ انداز میں کرتا ہے تو اس کی روداد غم سننے والے اشک فشانی میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں:

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں　　اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ　　کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے　　میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں　　یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا　　شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے　　رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو　　بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر　　پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں　　چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
کہیں تم اور کہیں ہم کیا غضب ہے　　فراقِ جسم و جاں دیکھا نہ جائے

گزرے ہوئے لمحوں کا ذکر دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتا ہے اور ہر جگہ اس ذکر میں ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذاتی رنگ کی خلش ہے۔

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں قبر سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا
گزرے ہیں وہ لمحے کہ رہ، یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

(انجم رومانی)

اس طرح جل رہا ہے دل جیسے
پھول کی پنکھڑی کو آگ لگے
آئی تو ہے بہار مگر ہم ملول ہیں
موسم ہے خوش گوار مگر ہم ملول ہیں

(عدم)

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگیٔ داماں کیا گیا

(یوسف ظفر)

شدت غم کم ہوئی اور دلوں کے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے تو شاعر نے حالات کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ زندگی صرف ماضی کی یادوں کے سہارے بسر نہیں ہوسکتی۔ زندگی کا دوسرا نام آنے والا زمانہ ہے اور آنے والے زمانے کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے عزم و عمل کی راہیں اپنانا ہوں گی۔ اس احساس نے غم کی داستان سنانے والے شاعروں کے دلوں میں عزم کے دیے روشن کر دیے اور انھیں اندھیروں میں اجالے اور شب کی ظلمتوں میں صبح کے نور کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ عبوری دور کی کیفیت کچھ اس طرح کی تھی:

ہمیں ہیں یورشِ ظلمت، ہمیں ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیش روِ صبح و روشنی پھر بھی

(مکین احسن کلیم)

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر — کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو ملا ہو ہمارا کہ جان و دل — محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

(فیض)

ور امید کی اس دور سے نظر آتی ہوئی کرن نے شاعر کے لیے عمل کا ایک ضابطہ مرتب کر دیا ہے۔ س نے خود بھی راہِ عمل پر گامزن ہونے کا عزم کیا ہے اور دوسروں کو اس راہ پہ چلنے کی دعوت دینے کو اپنا شاعرانہ منصب بنایا ہے:

عشق کی منزلِ اوّل پہ ٹھہرنے والو — اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

(حفیظ ہوشیارپوری)

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

(فیض)

اٹھو زمانہ کے آشوب کا ازالہ کریں — بہ نامِ گل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں

(سراج الدین ظفر)

اسی عزم کو ذرا اشارے کے انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ہر چند راستے میں تھے کانٹے بچھے ہوئے — جس کو تری طلب تھی گزرتا چلا گیا

(عدم)

ہم تقسیم کے بعد کے ابتدائی ۵۔۶ برسوں کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ یہ شاعری رجحانات کے اعتبار سے دو واضح مرحلوں سے گزری ہے۔ پہلا مرحلہ جذباتی شدت کا مرحلہ ہے اور اس مرحلے میں شاعر اشک شوئی، سینہ کوبی اور بہ قول شخصے نوحہ خوانی کے شغل میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس اشک شوئی، سینہ کوبی اور نوحہ خوانی میں بے کسی اور بے بسی کے عالم میں دل کی بھڑاس نکالنے کا [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے نزدیک مسلمانوں کی تباہی، بربادی اور ان کی خون ریزی کا ذمہ دار ہے۔ دل کی بھڑاس نکالنے اور زبان سے سب کچھ کہہ کر اپنی آتشِ غضب کو بجھانے اور جذبۂ انتقام کو تسکین دے لینے کے بعد اس کی شاعری اپنے شعور کے اس مرحلے میں داخل ہوتی ہے، جہاں امید اور عزم اس کا موضوع بن جاتے ہیں اور موضوع کی اس تبدیلی سے بلاشبہ شاعر دل کے لہجے میں ذرا ٹھہراؤ آجاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس مرحلے کی شاعری نصیحت، تلقین اور خطابت کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ جذباتی شدت میں اب سوچ بچار کا رنگ شامل ہو رہا ہے، لیکن سوچ بچار نے ابھی فکر کا وہ رتبہ حاصل نہیں کیا۔ جس میں شاعر ماضی، حال اور مستقبل کو ایک زنجیر کی کڑیاں بنا کر شعر کو قومی احساس کا رفیق، رہبر اور ترجمان بناتا ہے، اور شاعری میں قوم کے دینی اور تہذیبی مزاج کا رنگ پاتا جلوہ دکھاتا ہے اور وہ قومی تقاضوں کی تعبیر اور تفسیر کا فریضہ انجام دینے لگتی ہے۔

لیکن شاعری سے اس اہم دور کا جائزہ لینے سے پہلے شاید اس بات کا علم ضروری ہے کہ ناول افسانے اور غزل کے اس مختصر، اضطراری اور عبوری دور میں ان اصناف نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے حلقے میں مستقل طور پر یہ سوال غور و فکر کا موضوع بن گیا تھا کہ فسادات نے ادب پر کیا اثر ڈالا۔ فسادات اور ادبی تخلیق کے اس رشتے اور تعلق کی نوعیت کا جائزہ لینے والے اس نتیجے پر پہنچے کہ فسادات سے متاثر ہو کر ہمارے ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے ادب اور فن کے اعلیٰ معیاروں سے جانچا جائے تو اسے محض ادنیٰ درجے کا ادب قرار دیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں جذبے، فکر اور تخیل کا وہ امتزاج نہیں جس کے بغیر ادب اعلیٰ درجے کا ادب نہیں بنتا۔ اس کی حیثیت اس عارضی اور شدید ردِ عمل کی ہے جسے موجوں کے وقتی اضطراب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح یہ ردِ عمل وقتی اور عارضی ہے اسی طرح وہ ادب بھی وقتی اور عارضی ہے جو اس عارضی ردِ عمل کی ترجمانی کرتا ہے —— پڑھے لکھے لوگوں کے اس فیصلے نے ادب کی دنیا میں ہلچل مچا دی اور ادیب کے لیے کئی مسئلے غور و فکر کا موضوع بن گئے۔ سب سے پہلے مسئلہ تو یہ تھا کہ ادیب کو اپنا رشتہ کس فکری روایت سے اور کس ادبی روایت سے جوڑنا چاہیے؟ اس سوال کا ایک عام جواب تو یہ دیا گیا کہ ادیب کے لیے فکر اور احساس کی وہ روایت سب سے زیادہ اہم ہے جو ماضی سے منتقل ہوتی ہوئی اس تک پہنچتی ہے۔ اس روایت کو اگر تہذیبی روایت کا نام دیا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو فوراً یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تہذیب کا کون سا نظام ہے جسے ہم آزادی کے اس عہد میں اپنا سکیں۔ اس سوال کے جواب میں فکر کے کئی مکتب سامنے آئے اور پاکستان کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ نقادوں نے اپنے تہذیبی رشتوں کی وضاحت شروع کی۔ نقادوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہماری تہذیبی زندگی کی اساس وہ نظام اخلاق ہے جو ہمیں قرآن اور حدیث سے ملا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو تحریک کی صورت دینے والوں میں ماہر القادری نعیم صدیقی اسعد گیلانی جیسے صاحبان ہیں۔ لیکن ان سب کے سوچنے کے انداز میں جذباتی جانب داری نمایاں ہے۔ اس جذباتی جانب داری میں فکر کا رنگ شامل کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر عبداللہ کا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعے فن کار کو اسلامی فکر کی جو راستہ دکھایا ہے اس میں عملی نقطۂ نظر غالب ہے۔ یہی بات حسن عسکری کی ابتدائی تنقیدوں میں ہے جو ادیب کو زندگی کا ایسا راستہ دکھاتی ہیں جس کے ضابطے اسلام کی تعلیم سے اخذ کیے گئے ہوں۔ تہذیب یا کلچر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش میں بعض ادیبوں نے پاکستان کے موجودہ علاقوں کی تاریخ اور اس تاریخ سے پھوٹنے والے سوتوں کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اس گروہ کے نقادوں کو قومیت کی تحریک کا بانی کہا جاتا ہے۔ قومیت کی اس تحریک کی بنیاد وطن اور اس کی سرزمین پر قائم ہے۔ وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر اور شاعروں میں جعفر طاہر اور مجید امجد اس تحریک کے فکری اور عملی نمائندے ہیں۔ نقادوں کا ایک اور گروہ مادی زندگی کے تقاضوں میں اخلاقی اور روحانی معیاروں کی آمیزش کا خواہش مند ہے اور ادیب سے ایسے ادب کی تخلیق کا طالب ہے جس میں انسان کی مادی زندگی کی مصوری اور ترجمانی اور انسانی عمل کی جانچ اخلاقی اور روحانی پیمانوں سے کی جاسکے۔ نقادوں کے اس گروہ میں ڈاکٹر عبداللہ، حسن عسکری اور ممتاز شیریں کے علاوہ سب سے نمایاں نام سجاد باقر رضوی کا ہے جنھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ادیب اگر اپنی تخلیقات کی بنیاد ماضی کی پرستش پر رکھے یا اپنے ادب میں مستقبل قریب کی جھلک دیکھنے کی کوشش کرے تو اس کا ناول، اس کا افسانہ اور اس کی غزل سب خلا میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ ادیب کی نظر اپنے حال اور اس حال کے انسان پر اور اس انسان کی زندگی پر ہونی چاہیے۔ ایسا ادیب حال کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی ماضی کی روایت سے رشتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائم رکھتا ہے۔ نقادوں کا ایک گروہ وہ ہے جو اب بھی بلا ضرورت روایت سے بغاوت پر اصرار کرتا ہے اور اپنے خیال کے اظہار کے لیے ایسی علامتوں اور اظہار کی ایسی ہیئتوں کی جستجو میں مصروف ہے جو پڑھنے والوں کو محض اپنے نئے پن کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں لیکن ایسے ادب (جس کی تخلیق عموماً شعر کی صورت میں ہوتی ہے) اسے لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان کوئی جذباتی رابطہ قائم نہیں ہوتا۔ ایسی تنقید ہمیں جیلانی کامران کے یہاں ملتی ہے۔

تنقید کے یہ مختلف اسالیب اور ادب کو تہذیب کے کسی نہ کسی تصور سے منسلک کرنے کی کوشش جس طرح کے ادب کی تخلیق کا باعث بنی ہے اس کا جائزہ لیا جائے تو نثر اور نظم کے مختلف اصناف میں بڑی حوصلہ افزا رنگا رنگی بھی نظر آتی ہے اور آگے بڑھتے رہنے کی خواہش بھی۔ اس نقطۂ نظر سے میں سب سے پہلے ناول اور مختصر افسانے پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا۔

فسادات کے براہِ راست اثر کے تحت جو واقعاتی اور جذباتی ناول لکھے گئے ان کے بعد ادب میں تذبذب اور بے اطمینانی کا پیدا کیا ہوا خاموشی کا ایک مختصر دور آیا اور اس دور کو لوگوں نے جمود کا دور کہا۔ لیکن جمود کے اس دور کے فوراً بعد ایک ساتھ ناول نگاری کی کئی لہریں شروع ہوئیں۔ ایک لہر تاریخی ناولوں کی تھی ——— پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کے ساتھ معاشرتی زندگی میں اسلام کے ماضی سے رشتہ جوڑنے کا جو ولولہ پیدا ہوا اس کا اثر ہمارے ناول نگاروں نے بھی قبول کیا اور اسلامی تاریخ کے بعض ولولہ انگیز واقعات کی بنیاد پر ایم۔ اسلم، نسیم حجازی، اور رئیس امروہوی کے علاوہ بعض گم نام ناول نگاروں نے بہت سے ناول لکھے اور یہ ناول کچھ تو اس لیے کہ ان میں مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی کا عکس نظر آیا اور کچھ اس لیے کہ ماضی کی اس فضا میں گم ہو کر لوگوں کے لیے غم اور افسردگی کی اس کیفیت کو بھلانا آسان تھا جو اب بھی ان پر طاری تھی۔

دوسری طرح کے ناول وہ تھے جن کا مقصد محض دل بہلانا تھا ——— کچھ رومانی ناول اور کچھ مزاحیہ ناول۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ ناول تو شوکت تھانوی نے لکھے اور رومانی ناول اے۔ حمید، قیسی رام پوری، رئیس امروہوی اور ایم۔ اسلم نے۔ ان ناولوں کو نوجوان پڑھنے والوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ معاشرتی ناول لکھنے کا بیڑا خواتین نے اٹھایا اور اے۔ آر۔ خاتون کے شانہ بہ شانہ کئی خواتین نے اس میدان میں قدم رکھا اور اب جب کہ ہم بیس سال کے ادب کا جائزہ لینے بیٹھے ہیں تو مقدار کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتبار سے عورتوں کے لکھے ہوئے ناولوں کا مقابلہ ادب کی کوئی صنف نہیں کر سکتی۔ جن خواتین نے عموماً اے۔ آر۔ خاتون کی روش کو اپنایا اور بیسیوں ایسے ناول لکھے جنھیں ہم ملے جلے معاشرتی اصلاحی اور اخلاقی ناول کہہ سکتے ہیں ان کے علاوہ کچھ خواتین نے ایسے ناول بھی لکھے جنھیں مسائلی ناول کہا جا سکتا ہے۔ ان مسائلی ناولوں میں معاشرتی زندگی سیاست اور علم و ادب کے مختلف پہلوؤں کے ذکر اور بیان کے علاوہ جا بجا فکر کے آثار بھی نظر آتے ہیں اور پڑھنے والا واضح طور پر یہ محسوس کرتا ہے عورتیں گھر کی چار دیواری سے باہر آئی ہیں اور مشاہدے کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے بھی مطالعے اور تفکر کو ناول کی تخلیق کے لوازم سمجھنے لگی ہیں۔ ایسی ناول نگار خواتین میں قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، اور بانو قدسیہ کے نام پیش پیش ہیں۔ ان میں سے ہر لکھنے والی کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مشاہدے، مطالعے اور فکر کے امتزاج کے ساتھ ساتھ فن کا ادراک اور احساس نمایاں ہے اور ہر لکھنے والی نے اپنی بات کو پیش کرنے کے انداز میں انفرادیت سے کام لیا ہے۔

مرد لکھنے والوں نے بھی آہستہ آہستہ یہ محسوس کیا کہ انھوں نے عوام کی خوشنودی کے لیے جو تاریخی، رومانی اور جاسوسی ناول لکھے ان سے ادب کی کوئی خدمت نہیں ہوئی۔ اس کی مقدار میں تو بے شک قابل رشک اضافہ ہوا لیکن معیار میں انحطاط پیدا ہوا اور پستی آئی اور اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ناول ایسے لکھے گئے جنھیں ناول کے ضخیم سرمائے میں قابل قدر سرمایہ کہنا چاہیے۔ عزیز احمد کا "ایسی بلندی ایسی پستی"، احسن فاروقی کا "شام اودھ"، انتظار حسین کا "گھر"، فضلی کا "خون جگر ہونے تک"، ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" اسی طرح کی مستحسن کوششیں ہیں۔

افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، اے حمید، صادق حسین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انور، ابن الحسن، شوکت صدیقی، الطاف فاطمہ اور ان سے ذرا پہلے منٹو، محمود ہاشمی اور قدرت اللہ شہاب نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ فسادات افسانوں کا اچھا موضوع نہیں ہیں۔ چنانچہ شہاب نے اپنے طویل افسانے "یاخدا" میں محمود ہاشمی نے اپنے رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" اور منٹو نے اپنے بعض افسانوں اور افسانچوں میں فسادات کو پس منظر بنا کر بڑے فنکارانہ اور معروضی انداز میں اپنے زمانے کے واقعات کو موثر کہانیوں کے سانچے میں ڈھالا۔ ان میں سے ہر افسانہ نگار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے کہانی میں وہی کچھ لکھا ہے جو اس نے دیکھا ہے اور جس سے وہ متاثر ہوا ہے۔ ابن الحسن، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بعض افسانوں کا پس منظر لکھنؤ کی زندگی اور وہاں کے ایسے کردار ہیں جن کی روح بدلے ہوئے ماحول میں اب بھی انھیں ستا رہی ہے۔ ان لکھنے والوں کی بعض کہانیوں میں [illegible] کے ساتھ پاکستانی شہروں سے ایسے واقعات اور ایسے کرداروں کی نشاندہی کی گئی ہے جو نئے ماحول کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شوکت صدیقی کے افسانوں میں فسادات کی طرف ہلکے پھلکے اشارے ہیں لیکن ان اشاروں سے زیادہ ان کا موضوع وہ مہاجر ہیں جن پر جھنجھلاہٹ، اضمحلال اور پژمردگی طاری ہے اور جن کی پناہ گاہ یا تو ماضی کی یادیں ہیں یا پھر [illegible]۔ انور کے افسانے تقسیم کے بعد کے شہروں اور ان شہروں کے چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی سے واقعات کے افسانے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے واقعات میں بکھرے ہوئے مضطرب اور بے چین انسان کی کہانیاں انور نے بڑے دھیمے لہجے میں سنائی ہیں۔ ان کہانیوں کی رفتار بھی دھیمی ہے اور پڑھنے والے کو واقعات اور کرداروں کے ساتھ ساتھ چلنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اے حمید نے فسادات کے دردانگیز اور افسردہ کن ماحول سے باہر نکل کر مظاہر فطرت اور رومانی تصورات کی آغوش میں پناہ لی ہے۔ اس لیے ان کی کہانیاں پڑھتے وقت ہم زندگی کی تلخیوں سے بچ کر ایک ایسے ماحول میں پہنچ جاتے ہیں جن میں حسین یادیں ہیں، بھولے بسرے گیتوں کی صدائے بازگشت ہے اور ایسے کردار جو صرف داستانوں کے لیے مخصوص ہیں —— ان کہانیوں کی تلخیاں الف لیلہ کی تلخیاں ہیں۔

انتظار حسین کے اکثر افسانوں کا موضوع وہ معاشرہ ہے جس میں انھوں نے زندگی کے شب و روز گزارے ہیں اور اس معاشرے کی تہذیبی خصوصیتوں کو اپنی زندگی کا عزیز سرمایہ سمجھنے کی عادت ڈالی ہے۔ اس لیے اس نئے ماحول میں جو ان کے ماضی کے ماحول سے بالکل مختلف ہے وہ اسی تہذیبی سرمائے کو اپنی کہانیوں کی بنیاد بناتے ہیں جس نے ان کے قلب اور ذہن کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی، صادق حسین اور غلام الثقلین نقوی کے افسانے اس لحاظ سے اپنے معاصرین کے افسانوں سے مختلف ہیں کہ ان میں پاکستانی علاقوں کی زمین اور اس کی مٹی کی سوندھی خوشبو باقی چیزوں پر غالب ہے۔ انھوں نے شہر کی زندگی کی طرف سے آنکھیں بند تو نہیں کیں لیکن شہر میں رہ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی یہ بات شدّت سے محسوس کی ہے کہ پاکستان کی مٹی کا رنگ و بو شہروں میں کم اور دیہاتوں میں زیادہ ہے۔ اس لیے انھوں نے اس پاکستانی کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا ہے جس کی شخصیت میں پاکستان کی رواداری اور وضع داری جذب ہے اور جس نے اپنے آپ کو اب تک بدلا نہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا پس منظر بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس کا آغاز گھر کی زندگی سے ہوتا ہے جہاں ماں باپ، بہن بھائی اور آقا اور ملازم کے باہمی رشتوں میں محبت کا احساس اور گداز دوسری چیزوں پر غالب ہے۔ گھر سے باہر نکل کر معاشرتی زندگی کی مختلف سطحوں پر یہی محبت مہربانی اور عیسائی کی تنگ دائرے سے نکل کر اس زندگی پر چھا جاتی ہے جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے افسانے بھی ماضی کی یادوں اور ان یادوں میں بسنے والے ان انسانوں کے اقدار سے ہیں جن کے کرداروں کی ساخت میں محبت، ایثار اور وضع داری کے اوصاف سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ان افسانوں کے متعلق جن کا آغاز شہاب کے "یا خدا" سے ہوا اور جن میں فسادات کو براہِ راست موضوع بنانے کے بجائے لکھنے والوں نے ان تہذیبی اور معاشرتی قدروں کو ابھارا ہے جو انسان کی انسانیت کی مظہر ہیں جن کا دھیما پن نمایاں ہے اس لیے جب ہم ان کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر افسردگی طاری نہیں ہوتی۔ اعلیٰ انسانی قدروں پر سے ہمارا ایمان اٹھ چلا تھا اور ہم نے زندگی کے ماضیٔ قریب اور اس کے حال کو دیکھ کر انسان کی انسانیت کی طرف سے مایوس ہونے کی جو عادت ڈال لی تھی اس میں ان افسانوں کے مطالعے کے بعد زندگی پیدا ہوئی اور ہم نے اپنا سفرِ حیات نئے سرے سے شروع کیا اور اس سفر میں ایک بہتر زندگی کو اپنی منزلِ مقصود بنایا۔ خود افسانہ نگاروں کے دل میں زندگی کے سفر کی تھکن کا جو احساس اور بے منزلی کی جو کیفیت ابتدائی تین چار برس میں نظر آتی ہے رفتہ رفتہ دور ہوئی اور افسانہ نگار اپنے فن کے لیے جس منزل کی جستجو میں مصروف تھا اور جو اب بھی برابر جاری ہے اس کا اظہار ہمارے تین افسانہ نگاروں (اشفاق احمد، انتظار حسین اور اے حمید) کے ان تین افسانوں (یار من بیا۔ کارونیشن ہوٹل۔ اور سردیوں میں بارش) سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۸۔ نومبر ۱۹۶۷ کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کیے۔

ماضی اور اس کی روایت سے گہرے ربط کا احساس اور اس احساس کے ساتھ فن کی جو سنجیدگی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھہراؤ، جذبہ اور فکر کے امتزاج کا جو عکس اور بہتر سے بہتر کی جو جستجو اور تلاش کا جو جذبہ ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے یہاں مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اس کا اظہار سید امتیاز علی تاج، شاہد احمد دہلوی، رفیع پیر زادہ، ناصر شمسی، اصغر بٹ، اور بانو قدسیہ کی ریڈیائی تمثیلوں اور بعض صورتوں میں مرزا ادیب کے یک بابی ڈراموں میں ہوتا ہے لیکن اس کا زیادہ واضح ظہور ہمیں خواجہ معین الدین کے اسٹیج ڈراموں "لال قلعہ سے لالو کھیت تک" اور "مرزا غالب بندر روڈ پر" میں ہوتا ہے جن میں حال کی زندگی اور ماضی کی تہذیبی روایت کے درمیان ایک ربط قائم کرنے کا احساس ایک بڑی واضح صورت اختیار کرتا ہے۔ اپنے ادبی، تہذیبی اور ادبی ماضی کے ساتھ ربط قائم رکھنے کی یہ خواہش تنقید اور شاعری میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نقاد داستانیں ترتیب دینے اور نئے ماحول میں ان کی ادبی اہمیت متعین کرنے کے کام میں مصروف ہیں اور میر، مصحفی اور غالب کی شاعری کی نئی تعبیر اور تفسیر کر رہے ہیں۔ انھوں نے ماضی اور حال میں جو تہذیبی ربط تلاش کیا ہے اس کا اظہار ایک طرف تو ان کے مقالات اور کتابوں سے ہوتا ہے اور دوسری طرف ان کی مرتب کی ہوئی کتابوں کے ناموں سے ـــــ ان ناموں میں میرامن سے عبدالحق تک، ولی سے اقبال تک اور داستان سے افسانے تک تہذیبی ماضی اور حال کے درمیان ربط تلاش کرنے کے رجحان کے بڑے واضح مظہر ہیں۔

تہذیب اور ادب کے ماضی سے رشتہ قائم رکھنے کا رجحان ہماری پیس برس کی ادبی زندگی میں دو اور صورتوں میں بھی نمایاں ہوا ہے۔ پہلی صورت تو یہ کہ ہمارے نقادوں نے اپنے قدیم شاعروں کی شاعری اور اپنے عہد کی زندگی کے تقاضوں میں ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور میر اور غالب کے مزاج اور اپنے عہد کے مزاج میں مماثلتیں دریافت کی ہیں۔ نقادوں میں اس رجحان کو عام اور مقبول بنانے میں ڈاکٹر سید عبداللہ، آفتاب احمد اور سجاد باقر رضوی نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ دوسری صورت یہ کہ ہمارے کئی غزل گو شاعروں کو میر اور غالب کی شاعری اور اپنے مزاج اور اپنے عہد کے جذباتی اور فکری تقاضوں کے درمیان ایک خاص طرح کی مطابقت اور ہم آہنگی محسوس ہوئی ہے اور اس احساس نے میر اور غالب کی پیروی کو ہمارے عہد کی شاعری کی بڑی نمایاں خصوصیت بنا دیا ہے۔ احسان دانش، فضل احمد کریم فضلی، حفیظ ہوشیارپوری، انجم رومانی، ناصر کاظمی، سجاد باقر رضوی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہرت بخاری، احمد فراز، شہزاد احمد، سراج الدین ظفر، جمیل ملک، عزیز حامد مدنی اور مصطفیٰ زیدی کی شاعری جا بجا میرؔ اور غالبؔ کے جذبے، تخیل اور فکر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض شاعروں کے یہاں انیسؔ کے رنگ کی جھلک ہے اور بہت سے شاعروں نے اقبالؔ کے ملے جلے فکری اور رومانی انداز کو اپنایا ہے۔ اقبالؔ نے نئی شاعری کو نمایاں فکری رجحان دیا جس میں انسان کی عظمت کے ذکر کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے اپنے خصوصی طرز میں احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر، مصطفیٰ زیدی اور سجاد باقر رضوی انسان کے بلند رتبے کا ذکر بڑے پرجوش، شیلے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی نظموں میں بھی کرتے ہیں اور غزلوں میں بھی لیکن بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے یہ خیال شاعروں نے اقبالؔ سے لیا اور اسے اپنا کر پیش کر دیا ہے۔ میں دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ جمیل ملک کے ان اشعار میں اقبالؔ کی پیامِ مشرق والی آواز صاف سنائی دے رہی ہے:

یہ منظر یہ روپ انوکھے یہ شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں
صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے ان کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ جگ مگ، جگ مگ کرتے تارے ہیں
ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں
کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے میں یہ جلتے دیپ ہمارے ہیں

دوسری آواز احمد فراز کی ہے جو اپنے عہد میں پیامِ اقبال کی ناقدری دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور پیغمبرِ مشرق کے حضور میں اپنے دردِ دل کا حال یوں پیش کرتا ہے:

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم اپنے ماضی دفروا کے داغ دیکھیں گے
مگر یہ حال طلوعِ سحر کے بعد ہوا
جو تیرے درس کی تفسیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس سے، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے
عروجِ عظمتِ آدم تھا مدعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا ابھارتے ہیں
کس آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

عظمتِ آدم کا یہ تصور ہمارے شاعروں کو میر اور غالب کی شاعری سے بھی ملا ہے لیکن اس کی تکمیل کلامِ اقبال میں ہوئی اور اقبال نے اس عظمت کو جس ذات میں مجسم دیکھا وہ رسولِ مقبولؐ کی ذات تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد شاعری میں دینی احساس نے جو مختلف صورتیں اختیار کیں ان میں حمد بھی ہے، نعت بھی اور منقبت بھی۔ لیکن نعت ہماری نظم اور غزل کا مستقل موضوع بن گئی اس لیے کہ یہاں اقبال کی عظمتِ آدم کا تصور اور عشقِ رسولؐ ایک دوسرے میں جذب ہو گئے اور ہمارے شاعروں نے آں حضرتؐ کی ذاتِ گرامی کا ذکر ایسے والہانہ انداز میں کیا کہ نعت تغزل کی معراج بن گئی۔ دو تین شعر احسان دانش کے سن لیجیے:

شعور ہو نہ سکا اور خلق نے برسوں
خدا کو سامنے دیکھا ہے آدمی کی طرح

آب و گل میں مدتوں آرائشیں ہوتی رہیں
تب کہیں اک آدمی کو یہ شرف حاصل ہوا
دانش خدا کا شکر مجھے عشق کے لیے
بندہ بھی وہ ملا ہے جو مولا دکھائی دے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ اور رسولؐ کے ذکر کے علاوہ ان انسانی اقدار کی شاعرانہ تلقین بھی ہماری نظموں اور غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جن کا سرچشمہ دین محمدی ہے۔ عبدالعزیز خالد کا "فارقلیط" جعفر طاہر کا "ہفت کشور"، مختار صدیقی کا مجموعہ "سی حرفی" اور یوسف ظفر کے کلام کے بہت سے حصے اس دینی رجحان کے نمایاں مظہر ہیں جو قیام پاکستان کے بعد ہماری شاعری کا اہم موضوع بنا اور جو بہت سی صورتوں میں ظاہر ہونے کے علاوہ رسول کریمؐ کے ذکرِ مقدس کی شکل میں نمایاں ہوا۔

دینی رجحان کے علاوہ ایک اور رجحان جو قیام پاکستان کے فوراً بعد ابھر کر ہمارے سامنے آیا وہ قومیت کا وہ تصور ہے جسے ہم پاکستانی قومیت کا تصور کہہ سکتے ہیں اور جس کا آغاز حمید نسیم کے "غنائیہ" "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"، شان الحق کے "فیچر" "کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد" اور ش۔ صبحیٰ کے "ساقی نامے" سے ہوا اور جس کا رنگ یوسف ظفر کے مجموعے "حریم وطن"، مختار صدیقی کے "سی حرفی" اور جعفر طاہر کے "ہفت پیکر" میں چمکا۔

سی حرفی اور ہفت پیکر کا نام آیا تو اس رجحان کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد کی شاعری میں جہاں ایک طرف روایت کی محبت (خصوصاً غزل کے احیا کی صورت میں) کا اظہار ہوا وہاں شاعروں نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ وہ بیان کے نئے اسالیب اختیار کر کے اپنی شاعری میں جدت کا رنگ پیدا کریں اور شعر کے ایسے سانچے وضع کریں جن سے نئے خیال کے اظہار کے لیے مزید گنجائشیں پیدا ہوں اور نئی راہیں سامنے آئیں۔ جعفر طاہر کے کینٹو، مختار صدیقی کی سہ حرفی اور جیلانی کامران کا استانزا اور جمیل الدین عالی کے دوہے اسی طرح کے سانچے اور ہیئت کے اسی طرح کے تجربے ہیں جن کا ماخذ مغرب بھی ہے اور ہندی اور خالص مقامی روایت بھی۔ نثر کی اصناف میں رپورتاژ، اور سنجیدہ اور مزاحیہ انشائیہ نے ہمارے بیس برس کے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور اول الذکر کو فن کے حسن سے مزین اور آراستہ کرنے کی خدمت شاہد احمد دہلوی، محمود ہاشمی اور انتظار حسین نے انجام دی اور انشائیہ کو نئی زندگی وزیر آغا، مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی، انتظار حسین، مظفر علی سید، امجد حسین اور مشتاق احمد یوسفی کے ہاتھوں ملی۔ ہلکے پھلکے مزاح کو ادبی عظمت امجد حسین، شفیق الرحمن،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشتاق احمد یوسفی نے دی اور پڑھنے والوں کو ایک مرتبہ پھر محسوس ہوا کہ ادب و شعر کی دنیا پر فکری تعقل کا جو غلبہ تھا اس میں مزاح کی شگفتگی اب بھی زندہ ہے اور ہمارے شاعر عمل، عزم، امید اور اعلیٰ انسانی قدروں کی جو شمعیں روشن کر رہے ہیں ان میں انسان بننے، بننے اور ترقی اور بننے کے احساس سے غافل نہیں ہوا ہے۔

بات کچھ زیادہ بڑھ گئی پھر بھی ابھی دو تین باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ہمارے جن ادیبوں نے نثر اور نظم کی مختلف اصناف کو آگے بڑھایا ہے اور انھیں زندگی کے مسائل سے دوچار کیا ہے ان کا ذریعہ بنایا ہے اور فکر، تخیل اور جذبے کو ہم آہنگ کرنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان کے علاوہ ہمارے ناول نگاروں اور ہمارے شاعروں نے ترجموں کی طرف بھی نمایاں توجہ کی ہے اور اس توجہ کے اثر سے انگریزی کے بہت سے شہ کار ناول اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ ترجمے کو ادب کا ایک اہم مسئلہ سمجھنے کی طرف سب سے پہلے حسن عسکری متوجہ ہوئے اور خود ترجمے کے میدان میں آگے آئے۔ ان کے علاوہ عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، محمد سلیم الرحمن، اور شفیق الرحمن نے ترجمے کو تخلیق کا درجہ دیا۔ دوسرا اہم رجحان نثر اور نظم کے کلاسیکی شہ کاروں کو نئے سرے سے سامنے لانے کا ہے۔ یہ کام سب سے زیادہ مستعدی سے مجلس ترقی ادب نے انجام دیا اور پھر بزم اقبال، مجلس اقبال، مرکزی اردو بورڈ جیسے نیم سرکاری اداروں نے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں قدیم ادب اور ادیبوں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے اور طالب علموں کی نئی پود میں عصری ادب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کے مطالعے کا شوق زندہ رہا۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ادب کی وہ ضخیم تاریخ ہے جو پنجاب یونیورسٹی میں لکھی جارہی ہے اور غالب کی صد سالہ برسی منانے کا وہ منصوبہ ہے جس کے ذریعے غالب کی نثر اور نظم کے ساتھ ہمارا رشتہ اور مستحکم ہو جائے گا۔ پاکستان کے بیس سالہ ادب کا جائزہ ان رسالوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا جنھوں نے اپنے خاص اور عام شماروں کے ذریعے اردو کے عام قاری کو اپنے قدیم ادب تک پہنچنے اور اپنے عہد کے ادبی اور فکری رجحانات سے واقف رکھنے کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ رسالوں کے علاوہ اخبار بھی ادبی شناسائی کے اس رجحان کو عام کرنے میں حصہ لے رہے ہیں۔

۳۶۹۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان میں اردو ادب کے اس بیس سالہ جائزے کو محض سرسری جائزہ کہنا چاہیے اس لیے کہ ادب کے مختلف پہلوؤں میں ایک نئی زندگی اور نئے رجحان کے جو آثار اس مختصر سے دور میں نمایاں ہوئے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا ذکر تفصیل سے کیا جائے لیکن اس کی گنجائش نہ ہو تو بات یہ کہہ کر ختم کی جا سکتی ہے کہ ادب کی ہر صنف میں ادبی زندگی کے ہر گوشے میں اس بیس سال کی مدت میں جو کچھ ہوا ہے اس کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ ہر جگہ فکر، جذبے اور احساس میں ماضی اور حال کے درمیان ایک رشتہ قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ بات نمایاں ہے کہ سب لکھنے والے انفرادی طور پر اور تمام ادارے اجتماعی حیثیت سے ادب کو آگے بڑھانے اور اسے زندہ رکھنے کو ایک فریضے کی طرح انجام دے رہے ہیں اور دوسری خصوصیت یہ کہ پاکستان کے اردو ادب کو دین اور ملت کے احساس کا ترجمان بنانے کے علاوہ اسے ایک ایسے ادب کی صورت دی جا رہی ہے جو اپنے ظاہر و باطن میں خالصاً پاکستانی نظر آئے۔ اس ادب میں ماضی سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ حال کی زندگی سے تعلق قائم رکھنے کا جذبہ نمایاں ہے۔ ہر صنف میں نئے تجربے ہو رہے ہیں اور ادیب اپنے منصب کو اپنا قومی اور ملی فریضہ سمجھ کر تخلیقی سرگرمی میں مصروف ہے۔ جذبے اور فکر میں مکمل ہم آہنگی ہے اور بحث و تحمیص اور نکتہ چینی کا بازار گرم ہے کہ اس کے بغیر ادب نہ زندہ رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور بیس سالہ زندگی میں ہمارے ادیب نے زندہ رہنے اور ادب کو زندہ رکھنے کے علاوہ آگے بڑھنے کے عزم بالجزم کا اظہار کیا ہے۔ اس عزم میں شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، رسالے، اخبار اور ادارے سب اپنی اپنی بساط کے مطابق شریک ہیں اور یہی چیز ہے جس سے مستقبل کی بڑی روشن تصویر ہماری نظر کے سامنے آتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جناب سعید احمد

بنگلہ ادب

مشرقی پاکستان کا جدید بنگلہ ادب بیش قیمت اور اثر آفریں ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا عہد ختم ہونے کے بعد بنگلہ ادب پر ایک جمود طاری ہوگیا جسے توڑنے کی کوشش کئی قابل ادیبوں نے کی اور یہ کوششیں قیام پاکستان کے بعد بار آور ہوئیں۔ اس وقت زندگی کے بارے میں ایک نیا نقطۂ نگاہ ادیبوں کے سامنے آگیا تھا جس میں جوش، للکار اور امید کے پہلو بہت نمایاں تھے۔ اگر ہم ۱۹۴۷ کے بنگلہ ادب پر نظر ڈالیں تو ہمیں سرگرم و مستعد ادیبوں کا ایک گروہ دکھائی دے گا جس میں نذیر احمد، فرخ احمد، شہادت حسین اور غلام مصطفےٰ جیسے اہل قلم شامل ہیں جنھوں نے نغمے، نظمیں اور ڈرامے لکھے ہیں، اور ان کی تحریروں میں آزادی کی عظمت —— ایک نئے انسان، ایک نئی قوم کے ظہور کی عکاسی کی گئی ہے۔ بنگلہ ادب میں یہ ایک نئے باب کا آغاز تھا جس کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پس منظر بھی مختصر طور پر بیان کردیا جائے تاکہ موجودہ رجحانات کو بہ خوبی سمجھنے میں آسانی ہو۔

بنگال کی تاریخ کا پتہ تین ہزار سال قبل مسیح تک چلایا جاسکتا ہے اور برعظیم پاک و ہند کی قدیم دستاویزوں میں اس علاقے کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک قبیلہ جو بنگ کہلاتا تھا ایک زمانے میں یہاں آباد تھا اور لفظ بنگلہ اسی سے بنا ہے۔ ابوالفضل نے اپنی مشہور تصنیف "آئین اکبری" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فارسی میں بنگلہ کو بنگالہ کہا جانے لگا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے بنگال میں سامی نسل کے لوگ داخل ہونے لگے تھے۔ حال ہی میں راج شاہی کے ایک مقام پہاڑپور میں خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۶ء - ۸۰۹ء) کا ایک سکہ دریافت ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب یہاں تجارت اور اسلام کی تبلیغ کرنے میں مصروف تھے۔ سامی اقوام کی آمد کے بعد ہی افریقہ کے زنگیوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور پندرھویں صدی میں زنگی نسل کے کئی سلاطین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بنگال پر حکومت بھی کی۔ ان تاریخی واقعات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے بنگالی کی رگوں میں آریائی، غیر آریائی، منگولی، سامی، زنگی اور چند دوسری نسلوں کا خون دوڑ رہا ہے۔

بنگلہ زبان کی اصلیت کے متعلق جو تحقیقات کی گئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ اس کی اصل آریاؤں کی روزمرہ زبان پراکرت کی وہی مشرقی قسم ہے جس سے برعظیم پاک و ہند کے شمالی اور مغربی علاقوں میں اردو، پنجابی اور سندھی زبانیں پیدا ہوئیں۔ اس زبان میں ایسے الفاظ پچیس تا تیس فی صد سے زیادہ نہیں جن کی اصل سنسکرت ہے۔ نویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک بنگلہ زبان آگے بڑھتی رہی۔ ۱۲۰۱ء میں ہندوؤں کی حکومت ختم ہوئی اور مسلمانوں کے عہد حکومت کا آغاز ہوا۔ پہلے مسلمان حکمران بختیار خلجی نے بنگلہ زبان کی ترقی کا راستہ ہموار کردیا۔ رامائی پنڈت کی تصنیف "شون جنبر شما" فتح بنگال کے بعد لکھی گئی اور یہ پرانے سنسکرتی طرز تحریر سے مختلف ہے۔ ترکوں کا عہد حکومت ختم ہونے کے بعد کے دور میں شمس الدین الیاس شاہ (۱۳۴۲ تا ۱۳۵۷) تخت نشین ہوا جو بہت روشن خیال تھا اور اس نے بنگلہ زبان کو ترقی دینے کے لیے اس کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ سلطان غیاث الدین احمد شاہ کے دور حکومت میں پہلے مسلمان شاعر شاہ محمد صغیر نے "یوسف زلیخا" نظم کی اور اس کے تمام کرداروں کو بنگالی ماحول کے مطابق بنادیا۔ چنانچہ اس نظم میں یوسف کو خریدنے والے تاجر کا نام منیرو ہے جو ایک بنگالی نام ہے اور یہ تاجر یوسف کو ایک دھنیو میں خریدتا ہے جو ایک بنگالی سکہ ہے۔ مزید برآں یوسف کے چھوٹے بھائی ابن یامین کی شادی بنو میراوا سے ہوتی ہے جو مادھوپور کے راجہ کی لڑکی ہے۔ اس زمانے میں غیر مذہبی لٹریچر بالکل مفقود تھا اور ایک مسلمان ہی نے ادب میں اس نئے باب کا آغاز کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے مقامی ثقافت سے دل چسپی لی اور ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی۔ شمس الدین یوسف شاہ (۱۴۷۴ تا ۱۴۸۱) کی سرپرستی میں زین العابدین نے "رسول وجے" ایک مشہور نظم لکھی جس میں مشہور لڑائیوں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ شیر شاہ کو اس زبان سے اتنا لگاؤ تھا کہ اس نے ٹوپیوں پر اپنا نام اور القاب بنگلہ میں نقش کرایا۔

مغل فرمانرواؤں میں شہنشاہ جہانگیر کو بنگال سے گہری دل چسپی تھی اور شاہی خاندان کے جو افراد بنگال کے حاکم مقرر ہوئے ان میں بھی اس علاقے سے زیادہ دل چسپی لینے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ شیخ مطلب، عبدالحکیم اور محمد فصیح جیسے مشہور مصنفوں نے "کفایت المصلین"، "نصیحت نامہ" اور "مناجات" جیسی اہم

© rasailojaraid.com